سلسلۂ کلام حالی نمبر (۱)

یعنی

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ

رباعیات کا مکمّل مجموعہ

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپا ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۲ء

رباعی از حالی

24.5.02

ہے عازمِ راہِ دور عقلِ خود بیں
آگے مگر اپنی حد سے بڑھ سکتی نہیں
ہے شیشہ محل میں بند گویا کہ مگس
جب اُڑتی ہے رہ جاتی ہے ٹکرا کے وہیں

راقم و ناظم الطاف حسین حالی عفی عنہ
کربلائی یادگار برائے مکرمی منشی انوار احمد صاحب
مارہروی انجمنِ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس
نوشتہ شد ۲۳ دسمبر ۱۹۰
مقام لکھنؤ امین آباد
مکان عزیزی خواجہ غلام الثقلین

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یقیناً کسی پڑھے لکھے مسلمان کا دل ایسا نہ ہوگا جس پر مرحوم و مغفور مولٰنا خواجہ الطاف حسین حالی کے قومی احسانات، علمی فضائل، اخلاقی محاسن اور کمالاتِ شاعری کے نقوش مرتسم نہ ہوں اور وہ اعتراف اور شکرگزاری کے جذبات سے خالی ہو۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ جذبات بصورتِ عمل بہت ہی کم نمایاں ہوئے ہیں اور سترہ[۱۷] سال گزرنے پر بھی مرحوم کی کوئی ایسی یادگار قائم

نہ ہو سکی جو ہمارے جذبات قلبی کا مظہر و آئینہ ہوتی۔ تاہم غنیمت ہی کہ بعض اصحاب کی مخلصانہ کوششوں اور قابل قدر فیاضیوں سے ایک ہائی اسکول قائم ہو گیا ہی جس کے ساتھ متعدد ابتدائی مدارس کے علاوہ ایک عمدہ لائبریری بھی ہی، مگر سرمایہ کے اعتبار سے اس کا استحکام اور آیندہ ترقی مزید سعی و عمل اور ہمدردی و فیاضی اور مختلف تدابیر کی محتاج ہی۔

میں نے باوجود اُن کثیر اور گوناگوں ذمہ داریوں کے جو مسلم یونیورسٹی کے متعلق مجھ پر عائد ہیں، ان تدابیر مختلفہ میں سے بعض تدابیر کی عملی ذمہ داری محض اس لئے قبول کی ہی کہ مولانا مرحوم کے حقوقِ احسان سے کسی قدر عہدہ برآ ہو سکوں اور پانی پت اور اس کے گرد و نواح کے مسلمانوں کی تعلیمی خدمت میں کچھ حصہ لے سکوں۔

ان میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہی کہ مولانا مرحوم کی تصنیفات کی اشاعت سے (جو حسنِ طباعت بھی رکھتی ہو) اس یادگار کو مالی تقویت پہنچائی جائے چنانچہ اس سلسلہ کی ابتدا "مجموعۂ رباعیاتِ حالی" سے کرتا ہوں اور اس کے بعد دیگر اصنافِ کلام کو جدا جدا کتاب کی صورت میں اسی سائز پر

طبع اور شائع کیا جائے گا۔

مقدمۂ رباعیات مولانا وحید الدین سلیم (مرحوم) کا ایک عالمانہ مضمون ہے جو انھوں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۶ء میں مولانا حالی مرحوم کی (۲۴) تازہ رباعیوں کے ساتھ بطور تبصرہ شائع کیا تھا اس طرح سلیم کا نام بھی حالی کے نام کے ساتھ وابستہ اور تازہ رہیگا جو ان کا ایک عزیز و عقیدت کیش، ہم وطن اور ممتاز و بلند پایہ ادیب تھا اور جس نے نفس واپسیں تک اردو ادب کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

آخر میں ابوالاثر حفیظ جالندہری مصنف شاہنامۂ اسلام کی ایک نظم "یادِ حالی" کے عنوان سے بطور ضمیمہ شامل ہے۔

گزشتہ فروری میں جب کہ میں حالی میموریل ہائی اسکول کے بعض ضروری انتظامات اور مقامی اصحاب سے تبادلۂ خیالات کے لئے پانی پت گیا تھا اور اسی مقصد سے چند احباب وہاں جمع ہوئے تھے تو میری فرمائش سے حفیظ صاحب نے اثنائے سفر میں یہ چند اشعار موزوں کئے تھے جن کو ہم سب کے جذباتِ دلی کا ترجمان سمجھنا چاہیئے۔

اس موقع پر یہ نظم ایک جلسۂ عام میں سنائی گئی۔ وہ جتنی موثر ہے
اُتنے ہی حاضرینِ جلسہ متاثر ہوئے۔ اور بلاشبہ اس سفر کا کامیاب
نتیجہ بہت کچھ اس نظم کا بھی رہینِ منت ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مجموعۂ رباعیات ختم کرنے کے بعد جب ناظرین
"یادِ حالی" کا مطالعہ کریں گے تو ان کو بھی اپنے دل پر ایک خاص اثر
محسوس ہوگا۔

سیّد راس مسعود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا حالی کی تازہ رباعیاں

(نوشتۂ مولانا سید وحیدالدین صاحب سلیم پانی پتی)

میں ملک اٹلی کے نامور وطن پرست شاعر کاردوشی کا حال پڑھ رہا تھا جس نے حال ہی میں وفات پائی ہے کہ یکایک میرے پاس مولانا حالی کا خط پہنچا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں بائیس رباعیاں نکلیں، جو مولانا نے حال ہی میں لکھی ہیں اور جن کی میں نے اُن سے درخواست کی تھی۔

"کیا مولانا حالی ہمارے ملک کے کاردوشی ہیں؟" یہ ایک سوال تھا جو فوراً میرے دل میں پیدا ہوا۔

کاردوشی کی نسبت ملک اٹلی کے اخباروں نے لکھا ہے کہ اُس کی زندگی ملک اٹلی کی لٹریری زندگی تھی۔ جب وہ نہ رہا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس ملک کی لٹریری زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

میں بھی یقین کرتا ہوں کہ مولانا حالی کی زندگی ہندوستان کی لٹریری زندگی ہے۔ وہ بدنصیب دن خدا میری آنکھوں کے سامنے نہ لائے، جب کہ دوسرا فقرہ کسی کی زبان سے نکلے اور میرے کان اُس کو سُن سکیں۔ اس وقت ملک میں شاعر بہت سے ہیں، مگر وہ بجلیاں جو مولانا کے کلام میں ہیں، کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ہیں؛ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ ملک میں اُن کے سوا کوئی اصل شاعر موجود نہیں ہے۔

شاعری فنونِ لطیفہ میں شمار کی جاتی ہے، جس کی خوبیاں صرف مذاقِ سلیم سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ مسائل ریاضی و منطقی کی طرح اس کے حسن و قبح پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

کارلائل نے برنس کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بڑا شاعر ہی نہیں، بلکہ بڑا آدمی بھی تھا۔ بڑے آدمی کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں اپنے ملک کے پردۂ ظلمت کو چاک کرتا اور اُس کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک منور کر دیتا ہے۔ پھر اُس کا نور اور ملکوں میں بھی پھیل جاتا ہے۔

کیا یہی صفت مولانا حالی پر صادق نہیں آتی؟ اُن کے پُر جوش کلام نے ملک میں زلزلہ ڈال دیا ہے۔ تمام قوم کے جسم میں حرکت اور جنبش پیدا کر دی ہے جہالت اور تعصب کو اُن کے پُرتاثیر اشعار نے دُور کر دیا ہے اور علم و حلم کی لہریں ہر ایک فرد کے دل میں پیدا کر دی ہیں۔ یہ تمام قومی ہل چل جو مسلمانوں میں

ہو رہی ہے، سب اُن کے کلام کی برکت سے ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے
کہ وہ بڑے شاعر ہی نہیں، بلکہ بڑے آدمی بھی ہیں۔

کارڈوشی نے پندرہ برس جنگل میں بسر کئے۔ جب سورج طلوع ہوتا تو وہ اپنے
بستر سے اُٹھتا اور جنگل کی سیر میں مشغول ہوتا اور نیچر کے دل فریب منظروں کا لطف
اُٹھاتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ شاعری کے جذبات اُس کی روح پر چھا گئے اور وہ
اس قابل ہو گیا کہ آئندہ زمانہ میں بڑا شاعر کہلائے۔

مولانا حالی نے ایک مدت تک اپنی قومی سوسائیٹی میں عمر بسر کی اور
لوگوں کے عادات و خیالات کا غور سے مطالعہ کیا اور قوم کے اقبال و ادبار پر
گہری نظر دوڑائی۔ اس طرح رفتہ رفتہ دردناک جذبات اُن کے دل میں بھرتے گئے
جوشیلے خیالات اُن کی روح پر غالب آتے گئے، یہاں تک کہ اُن کی شاعرانہ
قوت اُبل پڑی اور وہ اس لائق ہو گئے کہ زمانۂ آئندہ میں بڑے آتش زبان
اور جادو بیان شاعر مشہور ہوں۔

کارڈوشی کو ورجل اور ہومر کے کلام سے بڑا انس تھا اور دونوں کا اثر
اُس کے کلام میں نمایاں ہے۔

مولانا حالی انیس اور میر کے کلام سے بہت مانوس ہیں اور ان دونوں
کی شاعری سے بہت لطف اُٹھاتے ہیں۔ اس لئے اُن کے کلام میں بھی ان
دونوں شاعروں کی جھلک پائی جاتی ہے۔

کارر دوشی کا قول ہے کہ "میں نے کسی امیر کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلایا، کسی اخبار کے اڈیٹر سے اپنی تعریف کی درخواست نہیں کی۔ میں نے قوم کے غصہ کی بھی پروا نہیں کی؛ کیوں کہ مجھے سچ بولنا اور سچ لکھنا تھا۔"

مولانا حالی کا حال بھی بالکل ایسا ہی ہے اور کچھ شک نہیں کہ طمع اور خوف نے اُن کی شاعری پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

کارردوشی نے ایک مشہور نظم لکھی، جس میں اُس نے چرچ کی موجودہ حالت پر حملہ کیا ہے۔ اس نظم نے تمام ملک میں ہل چل ڈال دی تھی اور اس کی موافقت اور مخالفت میں ہزاروں مضامین لکھے گئے۔

مولانا حالی نے بھی اپنی قوم کے علما کی حالت پر نظر ڈالی ہے اور مسدس میں اُن کی موجودہ حالت پر حملہ کیا ہے اور اُن کے بیانات پر بھی موافقانہ اور مخالفانہ تحریریں چھاپی گئی ہیں۔

(کارردوشی کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے اپنی شاعری سے تقلید کی بندشیں توڑ دیں۔ قدامت پرستی کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اہلِ ملک کو آزادانہ خیالات اور شریفانہ اخلاق پر مایل کیا اور اُن کے دلوں میں جدید تمدن کی روح پھونکی۔

مولانا حالی نے بھی اپنی شاعری کی بنیاد اسی مقصد پر رکھی ہے۔ انھوں نے بھی تقلید اور قدامت پرستی کا خاکہ اُڑایا ہے اور خیالات کی آزادی کی بنیاد ڈالی ہے اور اپنی قوم کو نیکی اور ہمدردی پر مایل کیا ہے اور نئی تہذیب سے

اُن کے دل و دماغ کو مانوس کر دیا ہے۔

کارڈوشی نے عمر کی ستّر منزلیں طے کیں اور ساری عمر ملک کی حمایت اور ہمدردی میں بسر کی اور اس کی شاعری کا سارا زور اسی ایک کام میں صرف ہوا۔

مولانا حالی نے بھی اپنی زندگی کا مقصد یہی قرار دیا ہے کہ اپنی قوم کے ساتھ ہمدردی کریں۔ اُن کے دلوں میں غیرت اور حمیت کا جوش پیدا کریں۔ اُن کو اوہام وتعصّب کی زنجیروں سے چھڑائیں۔ اُن کو زمانۂ حال کی ضرورتوں پر مائل کریں۔ ان کے دماغوں میں جدید تہذیب کی روشنی پہنچائیں اور اُن کو بمقابلہ دیگر اقوام کے علم وعمل میں سبقت لے جانے پر آمادہ کریں۔ اُن کی شاعری کی ساری قوت اسی ایک کام میں صرف ہو رہی ہے۔

کارڈوشی اور مولانا حالی کے حالات کا مقابلہ کرنے سے اس وقت میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مولانا حالی بے شک اس نامور وطن پرست شاعر سے بہت زیادہ مشابہ ہیں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے کارڈوشی کو مدت تک زندہ رکھے۔

اگرچہ کچھ عرصہ سے مولانا حالی نے دنیاوی مخمصوں میں مبتلا ہو کر کوئی بڑی اور مسلسل نظم نہیں لکھی اور وہ وقتاً فوقتاً صرف رباعیاں لکھا کرتے ہیں؛ مگر چونکہ ان رباعیوں میں بھی اُن کی شاعرانہ قوت موجود ہے اور یہ بھی اُسی قومی دل سوزی کی آگ کی چنگاریاں ہیں، جو اُن کے دل میں ہر وقت بھڑکتی رہتی ہے اور ان میں بھی وہی پاکیزہ الہامات ہیں، جو اُن کے فلسفیانہ دماغ پر اکثر

نازل ہوا کرتے ہیں؛ اس لئے ہم ان رباعیوں کو بھی نہایت خوشی اور فخر کے ساتھ اپنے اخبار میں درج کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اُن کا تازہ کلام درج کرتے رہیں گے۔

نوٹ

میں بائیس رباعیات مذکورۂ بالا کو پریس میں چھپنے کے لئے دے چکا تھا کہ مولانا حالی کا ایک اور خط پہنچا، جس میں دو اور تازہ رباعیاں درج ہیں اور جو بعد ان بائیس رباعیوں کے فی البدیہ اور حسب حال اُن کے قلم سے نکلی ہیں اس لئے میں ان رباعیوں کو (۲۳) اور (۲۴) نمبر پر آخر میں شامل کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ناظرین ان خاص رباعیوں کو غور سے پڑھیں گے۔ (داد دینے کے لئے نہیں، بلکہ اس لئے کہ ان میں قوم کی موجودہ افسوسناک حالت کی نہایت سچی اور عبرت انگیز تصویر کھینچی گئی ہے)۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۷ء)

رباعیاتِ حالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رُباعیات

توحید

کانٹا ہی ہر اک جگر میں اٹکا تیرا　　حلقہ ہی ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو جانا ہی ضرور　　بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہی کھٹکا تیرا

ایضاً

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

توحید

طوفاں میں ہے جب جہاز چکّر کھاتا　　جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہی جب اُٹھ جاتا　　واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ایضاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور　　منکر بھی پکار اُٹھتے ہیں تجھ کو مجبور
خفّاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ　　خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور

ایضاً

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے　　دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال　　لیکن انھیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

ایضاً

مٹّی سے، ہوا سے، آتش و آب سے یاں　　کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں[1]
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک　　گنجینۂ غیب میں اُسی طرح نہاں

---

[1] یعنی جو کچھ اب تک ظاہر ہوا ہے وہ بمقابلہ اس کے جو خزانۂ غیب میں مخفی ہے کالعدم یکن ہے

توحید

ہستی سے ہی تیری رنگ و بو سب کے لئے
طاعت میں ہی تیری آبرو سب کے لئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
سب اپنے لئے ہیں اور تو سب کے لئے

ایضاً

کیا ہو گی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد
دنیا میں نہیں ہی ایک دل جو کہ ہو شاد
پر جو کہ ہیں تجھ سے لَو لگائے بیٹھے
رہتے ہیں ہر اک رنج و غم سے آزاد

ایضاً

ہستی تری گو نہیں ہی محتاجِ دلیل
صبرِ دلِ مضطر کی مگر کیا ہے سبیل
یہ طبعِ خسیس مطمئن ہو کیوں کر
بے دیکھے ہوا نہ مطمئن جب کہ خلیل[1]

ایضاً

اے عقل کی فہم کی رسائی سے دور!
ادراک سے اوجھل! تو نظر سے مستور
یہ حسرتِ دید دل میں قائم رکھیو
بس یاس کی ظلمت میں یہی ہی اک نور

---

[1] چوتھے مصرع میں ابراہیم علیہ السلام کے اُس جواب کی طرف اشارہ ہے جو اُنھوں نے جناب الٰہی میں عرض کیا تھا کہ " بلیٰ ولکن لیطمئنّ قلبی "

توحید

سقراط منادی ہیں تری کام آیا   سر تیرے لئے حسینؑ نے کٹوایا
مر کر کوئی پائے، یا کہ سر کٹوا کر   پایا تجھے جس نے، اس نے سب کچھ پایا

ایضاً

دریا سے اٹھا کے بھاپ مینھ برسایا   پیراہنِ سبز خاک کو پہنایا
دانے کو کیا نخلِ تناور تو نے   پانی جڑ سے پھننگ تک دوڑایا

نعت

زہاد کو تو نے محو تمجید کیا   عشّاق کو مستِ لذّتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی   توحید کو تو نے آ کے توحید کیا

ایضاً

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا   اور امیوں کو خیر امم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار   بچھڑے ہوئے گلّہ کو بہم تو نے کیا

ایضاً

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف   یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر   آبا کو بھی ہے تیری ابوّت سے شرف

خدا کی بے نیازی

طبقے اُلٹے ہیں ترکتازی نے تری — منوائی ہے ہار سب سے بازی نے تری

جو گھر گھالے ہیں بے نیازی نے تری — ہے کالوری و کربلا اُس پہ گواہ

طلبِ صادق

دے گا اُسے صدقِ دل دلاسا آخر — طالب کا رہے گا پڑ کے پاسا آخر

دریا پہ پہنچ رہے گا پیاسا آخر — چھوٹی نہیں گر پیاس، تو آگے پیچھے

صلحِ کُل

شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں — ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں

وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں — جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا

ترکِ شعرِ عاشقانہ

بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی — بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی

ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی — جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا

پیرانِ زندہ دل

ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح — خوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح

ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح — دل اُن کے ہیں، ظرف اُن کے، جو کرتے ہیں بسر

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت　　ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص　　نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں　　پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح　　فرمایا کہ بھائی جان ہے تو جہاں

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا　　یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پہ اتنی ہے خبر　　اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

ایضاً

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ　　پیروں کو خرف اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری　　قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد اے فرزند　　ایک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں　　ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

دوستوں سے بے جا توقّع

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے
جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو مفتوں
گردن پہ نہ لو عقلِ خداداد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اب تم
کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
ہر عیب سے بچئے تا بمقدورِ ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو
گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع دم[1] اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

---

[1] دم دعویٰ اور قدم عمل

شرطِ قبول

ممکن ہے کہ جوہری نہ ہو قدر کہیں
پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہی مگر
عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

طالب کو سوچ سمجھ کر پیر بنانا چاہیئے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفان و یقیں
پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہو نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی
اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجامِ ترقیِ بشر
یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انساں میں عیب
ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

مسرف کو کیوں کر فراغت حاصل ہو سکتی ہے

اک منعمِ مسرف نے یہ عابد سے کہا
کر میرے لئے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوئے چرخ
محتاج کر اس کو جلد اے بارِ خدا

کام کی جلدی

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے ۔ آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ ۔ طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

غرض

ہے نفس میں انساں کے جبلّی یہ مرض ۔ ہر سعی پہ ہوتا ہے طلب گارِ عوض
جو خاص خدا کے لئے تھے کام کیے ۔ دیکھا تو نہاں اُن میں بھی تھی کوئی غرض

انقلاب روزگار

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں ۔ گڑ گڑ کے عَلَم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اس کی ہے نوبت تو کل اُس کی ہے ۔ بن بن کے یونہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

تقاضائے سِن

حالیؔ کو جو کل فسردہ خاطر پایا ۔ پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید ۔ وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو ۔ رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ۔ ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان — اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان — ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان — برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان — یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا — شیریں سخنی سے شہدِ فائق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہ ہو دل میں نفاق — آساں نہیں مقبولِ خلائق ہونا

مسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں یکّا — ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں یکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے — سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں یکّا

مکر و ریا

حالیؔ رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا — خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر — بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں — پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ — ہیں طوسی و رازی انہیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تونے ملکوں کو نہال — غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح — جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

ایضاً

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے — سرچشمۂ نعما و ایادی تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہی سایہ میں ترے — دنیا کا وسیلہ دیں کا ہادی تو ہے

ایضاً

ہی تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں — مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کی طرح — رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

خاندانی عزّت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلّت سے — عزت نہیں اس کو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہی کھات کا نسب بھی عالی — پر اس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

عزّت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا۔ مجھسے ہی عزت ہے جہاں ۔ فرمایا ہنر نے۔ میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی۔ غلط ہی دونو کا بیاں ۔ میں بھید ہوں حق کا جو ہی نیکی میں نہاں

توقعِ بیجا

ہیں یار رفیق۔ پر مصیبت میں نہیں ۔ ساتھی ہیں عزیز۔ لیک ذلّت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہی عبث ۔ جو نوعِ بشر کی خود جبلّت میں نہیں

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی ۔ اتنی ہی مغائرت ہی یہاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکرِ مآل ۔ ضدین ہیں دوستی و دُور اندیشی

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہی ۔ ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہی
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں ۔ کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہی

ایضاً

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا ۔ سلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل ۔ بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں ‏ بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں ‏ خوبی کوئی باقی نہیں جس امّت میں

سبب زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم ‏ سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت ‏ یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

دین و دنیا کا رشتہ

دنیا کو دیئے دین نے اسرار و حکم ‏ دنیا نے کمر دین کی تھامی جس دم
گر دین کی ممنون بہت ہے دنیا ‏ دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

آزادگانِ راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ ‏ کافر کہا واعظ نے انھیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت[1] ‏ لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

---

[1] یعنی کفر و ضلالت ایسی چیزیں ہیں جن کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مثلاً شیخ اکبر کو بعضوں نے صدیق کہا ہے اور بعضوں نے زندیق اور یہ بات کہ وہ فی الواقع صدیق تھے یا زندیق خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ پس جس شخص میں کوئی صریح اخلاقی برائی یا عیب موجود نہ ہو اُس کی تکفیر یا تضلیل کرنی ایسی بات ہے جیسے کسی جھوٹے مدعی کو شہادت نہ ملے اور وہ اپنے دعوے پر خدا کو گواہ قرار دے

بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار اُس قوم کا جینا ہے محالی دشوار
عزت کی نہیں ہی جس کو ہر گز پرواہ ذلّت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار

عفو باوجود قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

سختی کا جواب نرمی سے

فتنہ کو جہاں تلک ہو دبنے نہ سکیں زہر اُگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غصّہ غصّے کو اور بھڑکاتا ہے اس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

ہمّت

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لے کر سو بار
آخر سرِ بام لے کے پہنچا تو کہا "مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار"

کم ہمتی

جبریّہ و قدریّہ کی بحث و تکرار دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا — ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذّت سے ندامتوں کی جانا ہم نے — دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں — محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی — جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

گدائی کی ترغیب

اک مرد توانا کو جو سائل پایا — کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا ان کی گردن پہ وبال — دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

تکفیر اہلِ اسلام

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں — سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہوگا مرقد میں سوال — تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں؟

ترکِ عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو — کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں — چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

تنزّل اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد　　دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اوّل کوشش اور بعد دُعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے　　پھر چاہیئے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دستِ بازو سے لیا[1]　　پائی نہ نجات نوحؑ نے طوفاں سے

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لئے　　بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح　　مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے پیچ میں سب سمونے والے　　بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جن کی جیبوں میں مدام　　اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

---

[1] یعنی جب تک کہ کشتی نہ بنائی۔

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار بدظن نہ ہو عیب اُس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر کر حسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

سکوت درویش جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ موُنھ سے یا نہ بولیں حضرت معلوم ہے ہم کو جتنے پانی میں ہیں آپ

ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک منکرِ قرآن و خبر کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر اس سے بھی گیا کہ جس کے لاکھوں ہوں خدا

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق؟ سماعت نہ ہو جب کانوں میں دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

رفارم کی حد

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی　　کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبّے کو پہ اتنا نہ رگڑ　　دھبّا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اپنی تعریف سُنکر ناک بھوں چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور　　داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سُن کر ناخوش　　مقصود یہ ہے کہ ہو ستایش کچھ اور

حسنِ ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں　　نیکی میں شک اُس کی کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکۂ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ　　پر اس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں

دینداروں کی برائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حالِ اہلِ اسلام　　اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بد پرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار　　اور مفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

فکرِ عقبیٰ

منزل ہے بعید۔ باندھ لو زادِ سفر　　مواج ہے بحر۔ لو کشتی کی خبر
گاہک جو کس ہے۔ لے چلو مال کھرا　　ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہ گزر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں — ممکن ہے بدی کا نہ رہے اس میں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ پہ حقیقت یہ ہے — انساں ہے اب تک وہی قرن الشیطاں

سلاطین کا عشق

ہر چند برا ہے عشق کا سب کے مآل — پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً یہ وبال
سلطاں ہے اگر ظلّ الٰہی۔ تو عشق — ہے ظلّ الٰہی کے لئے وقت زوال

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ — پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے اگر ایک تو ہمارا ساتھی — پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

بڑھاپے میں موت کے لئے تیار رہنا چاہیئے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر — انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اُٹھا چکے اب — مجلس کرو برخاست۔ ہوا وقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا — زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک — ہے جوہرِ انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصہ قابل عفو ہے

غصّہ پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

سفہا کی مدح و ذم

کرتے ہیں سفیہ گر مذمت تیری کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر (نصیبِ اعدا) رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرضِ پیری لاعلاج ہے

اب ضعف کے پنجہ سے نکلنا معلوم پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

اسراف

مسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ ان کے ہنسیں بہتر ہے اس سے کہ فضولیوں پہ ان کی رو دیں

ردِّ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے نہ صواب زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بدتر ہے ہزار بار لے دوں ہمت سائل کے سوال سے ترا تلخ جواب

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں
جو دیکھ کے چکھ کے دل سے بھائے ہیں ہمیں

پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال
مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال

سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی
اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

اچھوں کو بُرا سننے میں بھی مزا آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا
جو کر کے بھلا خلق سے سنتے ہیں بُرا

ان گالیوں کا ہے جن کو چسکا حالیؔ
آتا نہیں اُن کو کچھ دعاؤں میں مزا

شکریۂ مدح کلام راقم[1]

جوشِ خمِ بادہ جامِ خالی میں ہوا
پھر ولولہ پیدا دلِ حالیؔ میں ہوا

تسلیمؔ نے دی کچھ اس طرح دادِ سخن
مجکو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

---

[1] مولوی تسلیم الدین مرحوم نارنول مقیم جےپور متخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اُردو اور فارسی کے راقم کے کلام کی ستایش میں اُس وقت بھیجے تھے جب کہ مدت سے فکر شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اُن قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی

احسان بے منت

احساں کے ہو گر صلہ کی خواہش تم کو
تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کر دو اسے عام
اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

قانون بد اخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار
حاشا کہ ہوا ان پہ نظم عالم کا مدار
جو نیک ہیں اُن کو نہیں حاجت ان کی
اور بد نہیں بنتے نیک ان سے زنہار

مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہل شر سے اڑنا نہ کہیں
بھڑکے گی مدافعت سے اور آتش کیں
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہل خلاف
جز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل
اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور
ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجکو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ بھرتے نہیں یوں
دل دیتے ہیں پر جی سے گزرتے نہیں یوں
تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

واعظوں کی سخت کلامی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام
واعظ نے درشتی سے کیا اُس سے کلام
بولا کہ حضور مقتدیٰ ہوں جس کے
ایسی ملّت اور ایسے مذہب کو سلام

تشنگیِ طلب

کب تک کوئی سوزشِ نہانی کو چھپائے
کب تک اپنے کو تشنہ سیراب دکھائے
کجدار و مریز سے تری اے ساقی!
پتھر کا کلیجا ہو تو پانی ہو جائے

پیری

علم و عمل و کتاب سے نفرت ہے
لکھنے پڑھنے کے نام سے وحشت ہے
تو نے ہر دردِ سر سے دی آ کے نجات
پیری! رحمت ہے! تجھ کو صد رحمت ہے

ایضاً

پیری نہیں منزلِ فنا ہے گویا
اب کوچ کا وقت آ گیا ہے گویا
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کافور
اک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

انسان کی عظمت بقدر قلت حاجت ہے

دولت کی ہوس - اصل گدائی ہے یہ　　سامان کی حرص بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے، تو ہے یہ شاہنشاہی　　اور کچھ نہیں حاجت، تو خدائی ہے یہ

افراطِ دولت کی مذمت

محنت سے وصول ایک پیسا ہو اگر　　کر اشرفیوں کی تھیلیوں پر نہ نظر
یہ کینچلی میں بھرا ہوا سانپ ہے! سانپ!!　　ہاں! سوچ سمجھ کے ڈالنا ہاتھ اس پر!!

دولت کی تعریف

دولت خرمن بھی - برقِ خرمن بھی ہے　　تلوار کی دھار بھی ہے جوشن بھی ہے
تھوڑا سا ہے اس میں شر، تو ہے خیر بہت　　گر سانپ ہے یہ تو سانپ کا من بھی ہے

حالتِ موجودہ پر قانع نہ ہونا

حاصل ہے اگر خوشی تو ہے غم کی تلاش　　گر شہد میسر ہے تو ہے سم کی تلاش
قانع نہیں کوئی حالتِ نقد پہ یہاں　　جنت میں بھی شاید ہو جہنم کی تلاش

خوشی کی امید رکھنا بڑی خوشی ہے

اولاد کا ہے ایک کے دل میں ارماں　　اور دوسرے پر ہے بارِ اولاد گراں
گر چاہیے عالمِ تعلق میں خوشی　　رکھے نہ یہاں خوشی کی امید انساں

سب صحبتیں برہم ہونے والی ہیں [1]

نقشے ہیں خوشی کے سب بگڑنے والے
پودے نہیں اس کے جڑ پکڑنے والے
مل بیٹھنا ہے یہ ناؤ ندی سنجوگ
ہیں اب کوئی دم میں سب بچھڑنے والے

جیسی رعیت ہوگی ویسی ہی اس پر حکومت کی جائے گی

حاکم سے بھلائی کی توقع ہے محال
جب تک کہ رعیت کے بھلے ہوں خصال
تم اپنے سوا کسی کے محکوم نہیں
عمّال [2] ہیں بس یہی تمہارے اعمال

دنیا کی موجودہ حالت

ہیں برف سے یخ سے ملک پامال کہیں
طاعون ہے نازل کہیں بھونچال کہیں
ابتر ہے کچھ ان دنوں نظامِ عالم
عمّال [2] نہ ہوں خلق کے اعمال کہیں

افسونِ محبت

ہے جن کو کہ صیدِ دلِ انسان کا خیال
لازم ہے کہ پھیلائیں محبت کا جال
استاد کو یاد ہو اگر حب کا عمل
تعطیل میں بھی نہ چھوڑیں مکتبِ اطفال

---

[1] اس رباعی میں ایک خاص صحبت کا ذکر ہے، جس میں سب اصحاب تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے سے بچھڑنے والے تھے

[2] اس رباعی میں حدیث ذیل کی طرف اشارہ ہے یعنی "عمالکم اعمالکم"

زخارفِ دنیوی کی بے ثباتی

گلشن میں نہیں ہے تری اے گل! جوڑی — تو نے نہیں آنِ حسن کوئی چھوڑی
تھا جی میں کہ تجھ سے باندھئے عہدِ وصال — پر کیجئے کیا عمر ہے تیری تھوڑی

غیروں کو اپنا بنانا

گر چاہو کہ جیتے جی بھلے کہلاؤ، — اپنوں کو سلوک نیک سے پرچاؤ
پر مدِّ نظر ہو گر حیاتِ ابدی — بیگانوں کو آشنا بناؤ، جاؤ!

کام کا وقت

یارو! نہیں وقت آرام کا یہ — موقع ہے اخیر فکر انجام کا یہ
بس حبِّ وطن کا جب چکے نام بہت — اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

ذلت کی زندگی

نکبت میں ہے رنج و غم خوشی سے اولیٰ — رونا یاروں کا ہے ہنسی سے اولیٰ
ہیں دیس میں بے وقار، پردیس میں خوار — مرنا ہے بس ایسی زندگی سے اولیٰ

قدرِ نعمت بعدِ زوال

دو چار اگر ہیں کام کرنے والے — ہیں اُن کو ہزاروں نام دھرنے والے
تب قوم کی شاید کہ کھلیں گی آنکھیں — مرجائیں گے جب قوم پہ مرنے والے

قومی خدمت کا صلہ

کہدو جنھیں اصلاح کا ہی قوم کی چاؤ — طعنے جھیلو، برا سنو، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہی سر دست — گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہی تو آؤ

تاسّف بر وفات نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم نیّر تخلص دہلوی

قمری ہی نہ طاؤس، نہ کبکِ طنّاز — آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبلِ زار — سو اُس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز

ایضاً

[1] غالب ہی نہ شیفتہ نہ نیّر باقی — وحشت ہی نہ سالک ہی نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

نواب [2] وقار الامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اس کی چھوڑ دی ہمراہی — اقبال پہ جس نے فتحیابی چاہی
حالی لے جائے کون بازی ان سے — ہی جن کی رگوں میں خونِ آصف جاہی

---

[1] یہ اُن شعرائے دہلی کے نام ہیں جن کے ساتھ راقم کو ربط اور اختصاص رہا ہی۔ عام اس سے کہ وہ مشہور و نامور ہوں یا نہ ہوں۔ حالی

[2] یہ رباعی ۱۳۰۹ھ میں جب کہ راقم حیدرآباد میں مقیم تھا اور نواب وقار الامرا بمبئی سے پولو میں بازی جیت کر آئے تھے لکھی تھی مگر اُن کی خدمت میں بھیجی نہیں گئی۔ خونِ آصف جاہی میں اس بات کا اشارہ ہی کہ حضور سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے لفظ میں اُنکے خطاب کی طرف اشارہ ہے ۱۲

نواب محسن الدولہ محسن الملک بہادر کی شان میں

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا   خدمت کے لئے قوم کی مرمر کے جیا
پیری ہوئی سدّ راہ اس کی نہ مرض   صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

ایضاً

مدرسہ میں سوتوں کو جگایا جاکر   غل علم کا برنا میں مچایا جاکر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی   واں آبِ حیات ان کو پلایا جاکر

ایضاً

پیری میں جوانوں کو کیا مات اُس نے   آرام پہ اپنے ماردی لات اُس نے
تدبیر سے محنت سے دکھادی سب کو   کالج کی ترقی میں کرامات اُس نے

ایضاً

مرکر مہدی نے زندگانی پائی   جی کھو کے جزائے جانفشانی پائی
زندہ تھے تو چند روز مہماں تھے یہاں   جب مر گئے عمرِ جاودانی پائی

ایضاً

جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ہیں   خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
مہدی سے وہ سیکھ لیں کہ اس کوچہ میں   یوں رہتے ہیں یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں

اخبار ہمدرد کی شان میں

تمغوں کی ہوس ہے یاں خطابوں کی طلب   اک ملک کی خدمت کا ہی سودا یا رب
ہمدرد کو اسم با مسمّٰی کیجو   اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے اب

رباعیاتِ قدیم

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت   مشکل سے بدلتی ہی بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اُس گلی میں جانا   عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے   جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
الفت پہ وفا پہ جاں نثاری پہ مری   آگے نہیں روتے تھے تو اب روئیں گے

فرقت میں بشر کی رات کیونکر گزرے   اک خستہ جگر کی رات کیونکر گزرے
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی   یہ چار پہر کی رات کیونکر گزرے

یاد اُس کی یہاں وردِ مدام اپنا ہے خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجئے کہ ہے نام اُس کا کس طرح نہ کیجئے کہ کام اپنا ہے
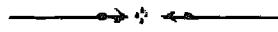
کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ !!! لاحول ولا قوۃ الا باللہ

حُر کہتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل گمراہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
سرگشتگیِ کوئے ضلالت کب تک؟ اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل
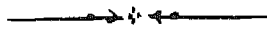
گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی یزید واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

تمت

یادِ حالیؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یادِ حالیؒ

نشانِ زندگی پاتا ہوں۔ پانی پت کی راہوں میں
یہ منزل منزلِ مقصود ہے میری نگاہوں میں
یہاں نقشِ قدم موجود ہیں اُن کاروانوں کے
زمیں پر جن کے آگے سر جھکے تھے آسمانوں کے
یہاں لہرا چکے ہیں پرچم اسلامی نشانوں کے
یہاں ٹکرا چکے ہیں جوش مغلوں اور پٹھانوں کے

اذانوں کی صدائیں بس چکی ہیں ان ہواؤں میں
فضائیں محو ہیں اب تک انہی دل کش صداؤں میں

فلک نے اس زمیں پر شعلہ ہائے جنگ دیکھے ہیں
زمیں نے اس فلک پر انقلابی رنگ دیکھے ہیں

یہیں امنڈا تھا دریا مرہٹوں کی تند فوجوں کا
تلاطم تھا یہیں اس جوشِ انسانی کی موجوں کا

بشر کی ہمّتِ عالی کا منظر اس نے دیکھا ہے
کہ احمد شاہ ابدالی کا لشکر اس نے دیکھا ہے

اسی وادی میں گونجی تھیں وہ باطل سوز تکبیریں
اسی میدان میں چمکی تھیں شمشیروں پہ شمشیریں

یہیں چپ ہو گئے تھے وہ سماعت پاش جے کارے
یہیں سے کھا کے بھاگے تھے شکستِ فاش پنڈارے
یہ کثرت کے آگے شانِ قلت اس نے دیکھی ہے
جہاں حق ہو۔ وہاں باطل کی ذلت اس نے دیکھی ہے

یہاں آتے ہی مردانِ مجاہد یاد آتے ہیں
جو تلواریں اُٹھاتے تھے وہ زاہد یاد آتے ہیں
اِسی باعث مِلا اس سرزمیں کو رُتبۂ عالی
کہ اس بستی کی خاکِ پاک سے پیدا ہوا حالیؔ
وہ حالیؔ جس نے ابدالی سے بڑھ کر معرکہ مارا
تکلّم سے مسخّر کر لیا ہندوستاں سارا

وہ شاعر جس نے اصنافِ سخن میں شان پیدا کی
بنائے خود ہی پیکر اور خود ہی جان پیدا کی
وہ بلبل جس نے گلہائے سخن کو زندگی بخشی
خزاں کے دورِ دورے میں چمن کو زندگی بخشی

وہ حالیؔ جو علمبردار تھا دینِ پیمبر کا
وہ حالیؔ جو سپہ سالار تھا سیّد کے لشکر کا
وہ حالیؔ جس نے دل کو درد سے آگاہ فرما کر
کیا مُردوں کو زندہ قُم باذن اللہ فرما کر
جگا کر خاکیوں کو گنبدِ افلاک کے نیچے
وہ حالیؔ آج محوِ خواب ہے اس خاک کے نیچے

وہ حالیؔ، ہاں وہی سرسیدِ مرحوم کا بازو
وہ اُمّت کی سپر، وہ ملّتِ مظلوم کا بازو
دلوں کو تیرِ حُبِّ قوم سے برما دیا جس نے
مسلمانوں کے خونِ سرد کو گرما دیا جس نے
وطن میں جس نے اسلامی اخوّت کی بنا ڈالی
پڑا ہے آج اپنے ہی وطن میں بے وطن حالیؔ
نہ بھول اے شاہِ اقلیمِ سخن کے مولد و مدفن!
اسی تربت سے ہے اب روضۂ رضواں ترا گلشن
نہ بابرؔ تیرے دامن میں، نہ اکبرؔ ہے نہ ابدالیؔ
تری بزمِ کہن کی زیب و زینت ہے فقط حالیؔ

تری شہرت کا باعث یہ چراغِ زیرِ دامن ہے
اسی کی یاد سے تیرے شرف کی شمع روشن ہے

بقائے نام ہے تیری، بقائے نامِ حالؔی سے
سخن کی سرخوشی قائم ہے اب تک جامِ حالؔی سے

نبردِ زیست میں ملحوظ رکھ پاسِ دیانت کو
امانت کی طرح محفوظ رکھ اپنی امانت کو

دوامی زندگی بخشے گا تجھکو نام حالؔی کا
سُنا! سارے زمانے کو سُنا پیغام حالؔی کا!

دعا یہ ہے کہ جب تک شوکتِ اسلام باقی ہے
خدا کا اور محمدؐ مصطفیٰ کا نام باقی ہے

مساجد سے اذانوں کی صدا اُٹھتی رہے جب تک
مدینے کی طرف بانگِ درا اُٹھتی رہے جب تک

جہانِ دل نہ ہو جب تک سپاس و شکر سے عاری!
الٰہی چشمۂ الطافِ حالی بھی رہے جاری!!!

ابوالاثر حفیظ جالندھری

(حسب ارشاد گرامی نواب مسعود جنگ بہادر سید راس مسعود صاحب
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)